عابد مسعود ڈوگر (چیچہ وطنی)

بدلتے موسم اور ہماری بے خبری

گزشتہ مئی کے اواخر میں پاکستان میں چند بیانات امورِ خارجہ کے حوالے سے ایسے سامنے آئے۔ جنہوں نے ملک کے اندر اور باہر متعلقہ حلقوں کو چونکا دیا ہے۔ کیونکہ یہ بیانات نہ صرف ایک ایسی خارجہ پالیسی کی نشاندہی کر رہے ہیں جس کا پہلے کوئی وجود نہیں ہے بلکہ ان بیانات کو اگر ۹/۱۱ کے تناظر میں دیکھا جائے جس کے بعد بین الاقوامی صورتحال اور خصوصاً یہ خطہ اور دیگر مسلمان ممالک گزر رہے ہیں۔ ایسے میں یہ بیانات ایک نئی تبدیلی کی علامت سمجھے جاسکتے ہیں۔ پاکستان کی خارجہ پالیسی کے بنیادی عناصر میں یہ بات پہلے دن سے شامل ہے کہ اس ملک کے اپنے پڑوسیوں سے تعلقات خوشگوار رہیں بلکہ حتی المقدور جنگ سے بچنے کی اور اختلافات میں الجھے بغیر دوستی کی پالیسی پر عمل کیا جائے کیونکہ اس ریاست کے روز اوّل سے کوئی جارحانہ عزائم نہیں ہیں۔ بلکہ یہ ملک اپنے ایک ازلی دشمن اور جارح ریاست کو ہمسایہ رکھتا ہے۔ اس لیے اس کی فوجی قوت اقدامی کی بجائے دفاعی ہے۔ اس کے علاوہ دوسری اہم بات جو اس ریاست کی خارجہ پالیسی میں شامل تھی کہ ہم بعض ایشوز پر صرف اس لیے ایک مؤقف اپناتے تھے کہ اس کا اظہار مسلم امہ اور مسلمانوں سے یکجہتی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ اس حوالے سے جو نمایاں مثال پیش کی جاسکتی ہے وہ اسرائیل کی ہے۔ مسئلہ فلسطین کے حوالے سے ہم نے اپنی خارجہ پالیسی میں اس ملک کو جو اہمیت دے رکھی ہے' یہ صرف فلسطینیوں، عربوں اور مسلمانوں سے یکجہتی کے لئے ہے۔ ہم نے ہمیشہ اسرائیل کی حمایت سے اس لیے گریز کیا کہ یہ ریاست ایک ناجائز ذریعے سے وجود میں لائی گئی اور اس کا وجود ہمارے مسلمان بھائیوں کے قتل وخون کی علامت ہے۔ اسی لئے پاکستان کے پاسپورٹ پر آج تک یہ لکھا ہوا ہے کہ یہ قانونی دستاویز دنیا کے تمام ممالک کے لیے سفر کرتے وقت کارآمد ہے۔ اسرائیل کے علاوہ اب جبکہ بہت سے عرب ممالک نے مصر کی پیروی کرتے ہوئے اسرائیل سے ظاہری اور خفیہ تعلقات قائم کر لیے ہیں اور عربوں کے علاوہ ترکی نے اس معاملے میں خاص طور پر تیزی دکھائی ہے۔ اس کے باوجود ہماری اس طے شدہ خارجہ پالیسی کے اعلانیہ تبدیل کرنے کی فضا ملک میں موجود نہیں ہے۔ ۹/۱۱ کے بعد چونکہ دنیا بدل چکی ہے اور یہودیوں کی سپر گورنمنٹ کا تصور ایک خوشنما خول سے نکل کا باہر آ گیا ہے جس سے یہ صاف نظر آ رہا ہے کہ یہودی پروٹوکولز کے طے شدہ ایجنڈے کے مطابق اب پوری دنیا کے ممالک کو یہودیوں کی مرضی سے باقی رہنا پڑے گا۔ جو قوم اور ملک اس ایجنڈے کی راہ میں رکاوٹ ڈالے گا پتھر کا ہو جائے گا۔ اس لئے ان بڑی تبدیلیوں میں سے ایک تبدیلی پاکستان کی طرف سے اسرائیل کو تسلیم کرنے کی تدبیر کی جا رہی ہے جاننے والے جانتے ہیں اسی دورِ حکومت میں ۲۰۰۲ء میں پاکستانی حکومت کی چھڑ چھاپ تلے ایک سرکاری وفد اسرائیل گیا

تھا جو تقریباً سارے معاملات طے کر آیا ہے۔ وقت گزرنے کے دیر ہے۔ دھندلا منظر آہستہ آہستہ شفاف ہو جائے گا۔ پاکستان سے باہر کی دنیا کے اخبارات میں اس وفد سے متعلق اس وقت متعدد خبریں شائع ہوئی تھیں اور نامی گرامی صحافی جو پہلے فوج میں تھے۔ ان کو ۲۰۰۲ء کے الیکشن میں بغیر اپلائی کئے سینٹ کے ٹکٹ سے بھی نوازا گیا تھا جو انہوں نے بوجوہ قبول نہیں کیا۔ اس بارے میں خاصی معلومات رکھتے ہیں۔ ۲۷، ۲۸ مئی کو اسلام آباد میں معروف جرمن جریدے ''ڈر شپیگل'' کو صدرِ محترم نے انٹرویو دیتے ہوئے اسرائیل کے وزیراعظم ایریل شیرون کی ذاتی طور پر اتنی تعریف کی جو کہ کم از کم نہ پہلے کبھی کسی پاکستانی سربراہِ حکومت اور نہ کسی مسلمان حکومت کے سربراہ سے سنی گئی۔ جنرل صاحب نے فرمایا کہ وہ شیرون کو ''ایک بڑا سپاہی، دلیر اور منجھا ہوا سیاستدان'' سمجھتے ہیں۔ اس قسم کے الفاظ کے استعمال کا مطلب ایک ہی ہو سکتا ہے کہ ان خیالات کے اظہار سے اور ان تاثرات کے منظرِ عام پر آنے سے امریکہ اور اسرائیل خوش ہو جائیں یا کم از کم مطمئن رہیں کہ پاکستان اور اسرائیل حکمتِ عملی کے اعتبار سے ایک دوسرے کے ساتھ ہیں اور طے شدہ خفیہ ہدف کو حاصل کرنے کے لئے مسلسل آگے بڑھ رہے ہیں۔ ایریل شیرون کتنے دلیر اور کتنے بہادر ہیں اس کا مظاہر روزانہ پوری دنیا کے الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا پر صبح شام دیکھا جا سکتا ہے اور ان کی بہادری کے چرچے ہر روز سنے جا سکتے ہیں۔ جب چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں کو جن کے ہاتھ میں سوائے پتھر کے اور کچھ نہیں ہوتا ان کو میزائلوں اور ٹینکوں سے ظالمانہ طریقے سے قتل کیا جا رہا ہوتا ہے۔ ایریل شیرون بڑے سپاہی ہیں کیونکہ ان کی چھوٹی سپاہ روزانہ درجنوں فلسطینیوں کو ان کے گھروں سے بے گھر کر دیتی ہیں اور یہ کام آج سے نہیں کئی عشروں سے وہ انتہائی ذمے داری کے ساتھ سرانجام دے رہے ہیں۔ ان کی بہادری کا ایک اور اعتراف جنرل صاحب سے ذرا ہٹ کے اسرائیل کی سپریم کورٹ نے بھی کیا ہے۔ جس نے انہیں صابرہ اور شتیلا مہاجر کیمپوں میں نئے نہتے فلسطینیوں کو بند کر کے فوج کے ذریعے سینکڑوں معصوم شہریوں کو موت کے گھاٹ اتار دینے کا ذمے دار قرار دیا ہے اور باوجود اس کے کہ وہ ایک فوجی جرنیل اور کارروائی میں بطور ڈیوٹی آفیسر کے یہ سب کچھ سرانجام دے رہے تھے ان کو فلسطینیوں کے قتل کا ذمے دار ٹھہرایا گیا ہے۔ ایسے خیالات کا اظہار اور ایسے جنونی قاتل کے بارے میں اتنے تعریفی کلمات کہنے والوں کے اپنے عزائم کی خطرناک نشاندہی کر رہے ہیں۔ دوسری اہم بات جو صدر صاحب نے جرمن جریدے کو انٹرویو کے دوران کہی وہ یہ تھی کہ ''ایران ایٹم بم بنانے کے لئے بے چین ہے'' اور دلیل کے طور پر ایران کو ایٹمی مقاصد سے باز رکھنے کے لیے یہ ارشاد فرمایا کہ اس ملک کی اسرائیل کے ساتھ کوئی سرحدیں نہیں لگتیں اس لیے اس کو براہِ راست کوئی ایسا خطرہ نہیں ہے جس کو جواز بنا کر ایران ایٹمی ہتھیار بنا سکے اس کلمات نے ہمارے اور اہلِ ایران کے درمیان صدیوں سے قائم تہذیبی، ثقافتی، رشتوں کو دفعتاً کتنا مضبوط کر دیا ہے اس کا اندازہ ہمیں وقت گزرنے کے بعد مسلسل ہوتا رہے گا۔ ایران نے سفارتی آداب کا لحاظ کرتے ہوئے جنرل صاحب کی طرف منسوب ان جملوں کو خلافِ حقیقت قرار دے کر سفارتی فضا کو ہموار کرنے کی کوشش کی ہے ان خیالات کے بعد جو ایران کے بارے میں ارشاد فرمائے گئے عرصے سے قائم ایک خدشہ

حقیقت کا روپ دھارنے کے بالکل قریب ہے اور وہ یہ ہے پاکستان افغانستان کے بعد ایران کی تباہی کے لئے اپنا کندھا پیش کرنے جا رہا ہے اور اس کے لئے ملک میں ایران مخالف حلقوں سے حکومت کی مختلف چینلز پر بات چیت کی خبریں بھی اخبارات میں آ رہی ہیں۔ کاش کہ ہم روس کے واپس چلے جانے کے بعد افغانستان میں اپنی پسند اور ناپسند کا کھیل نہ کھیلتے اور افغان عوام کو خود اپنا ملک سنبھالنے کا موقع فراہم کرتے تو کتنا اچھا ہوتا۔ افغان جو کرتے خود کرتے اپنے گھر میں کرتے حالات جیسے ہی کیوں نہ ہوتے۔ کابل میں قائم ہونے والی ہر حکومت کے تعلقات پاکستان سے نہ صرف انتہائی خوشگوار بلکہ نیاز مندانہ ہوتے لیکن

اے بسا آرزو ئے کہ خاک شدہ

ایسا نہیں ہوا ہم نے اپنی پسند کو وہاں اقتدار دلانے کی سعی لا حاصل کی اور ہمارے دوسرے ہمسائے ایران نے اپنے مفادات کی جنگ افغانستان میں وہاں آباد افغان ہزارہ جات کے ذریعہ لڑی۔ نتیجتاً اس لڑائی میں پاکستان اور ایران بالواسطہ ایک دوسرے کے سامنے تھے اور یہ سامنا کئی برس سے ہنوز خفیف درجے میں ہی سہی لیکن جاری وساری ہے۔ کاش کہ ہم اپنے ملی فرض کی ادائیگی کے بعد اپنے گھر واپس آ جاتے اور ایران والے ایران چلے جاتے۔ تب پاکستان، افغانستان اور ایران مضبوط دوست، مثالی ہمسائے اور بہترین تجارتی حصہ دار ہوتے۔ جس کے فوائد ان تینوں ملکوں کے عوام کو پہنچتے۔ نہ صرف خوشحالی ہوتی بلکہ تینوں ملکوں میں امن اور سکون بھی ہوتا۔ ایران کی پاکستان کے ساتھ در پردہ مخاصمت کی دوسری وجہ ۱۹۷۹ء کے انقلاب کے بعد اس انقلاب کو پاکستان میں ایکسپورٹ کرنا بھی ہے۔ جس کی وجہ سے یہاں قتل وغارت کا ایک طویل سلسلہ دو مختلف نقطہ ہائے نظر رکھنے والے طبقوں کے درمیان شروع ہوا اور کئی کروٹیں بدل کر آج تک جاری وساری ہے جس سے وطنِ عزیز کا اجتماعی وجود نہ صرف نڈھال ہے بلکہ زخم زخم ہے۔ اپنے نظریاتی دوسرے طبقوں پر تھوپنے بلکہ مسلط کرنے کی روایت جہاں جہاں چلے سوائے قتل وغارت کے کسی کے ہاتھ کچھ نہیں آیا۔ تازہ بیانات جہاں آنے والے دلوں میں بدل جانے والی فضا کا پتا دے رہے ہیں وہاں بڑھنے والوں کو اور دیکھنے والوں کو یہ درس بھی دے رہے ہیں کہ کب تک ہم اپنے نظریات کا قتل کر کے اور قوم کی امنگوں کا خون کر کے غیروں کی خوشنودی حاصل کرتے رہیں گے۔ قوم جب تک اپنے اندر یہ شعور پیدا کر کے اس کا پرزور اظہار نہیں کرتی کہ بہت ہو گیا اب ملک کی بھاگ دوڑ ان لوگوں کے ہاتھ میں دے دینی چاہئے جو اس ملک کو اس میں نافذ آئین کے مطابق چلانے کی صلاحیت رکھتے ہوں اور ملک کی پالیسیاں، ادارے اور ان میں بیٹھے ہوئے محبّ وطن حلقے باہمی مشاورت سے ترتیب دیں نہ کہ سربراہان کے ذاتی خیالات کو پالیسیاں بنا لیا جائے۔ اس ملک میں جب تک عوام کے عوام کے ووٹ کا بوٹ کے ساتھ ٹکراؤ ختم نہیں ہوتا اور ہر ادارہ آئین میں درج اپنے دائرے میں رہنے کی طرح نہیں ڈالتا اس وقت تک نہ تو کوئی بڑی انویسٹمنٹ اس ملک کو استحکام بخش سکتی ہے۔ اور نہ ہی کوئی زیرک قیادت دیس کی کشتی کو منجدھار سے نکال کر کنارے لگانے کا معجزہ دکھا سکتی ہے۔